4

فروغِ جمہوریت

فروغ جمہوریت

سیاسی عمل میں شرکت

......ریاست اپنے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

آئینِ پاکستان

[دیباچہ]

......جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے، اس کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔

[دیباچہ]

بنیادی حقوق کی مکمل ضمانت دی جائے گی جہاں تک کہ قانون اور اخلاق عامہ اس کی اجازت دیں۔

[دیباچہ]

ریاست علاقائی سطح پر منتخب نمائندوں کے ذریعے مقامی حکومت کے اداروں کی حوصلہ افزائی کرے گی، اور ان اداروں میں کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کو خصوصی نمائندگی دینے کا اہتمام کیا جائے گا۔

[آرٹیکل-32]

......یہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے یقینی بنایا جائے، ورنہ انسان عاجز آکر جبر واستبداد اور ظلم کے خلاف خود بغاوت پر مجبور ہو جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[ابتدائیہ]

تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

[آرٹیکل-1]

1۔ ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طریقے سے منتخب کیے گئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

2۔ ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق حاصل ہے۔

3۔ عوام کی مرضی حکومت کے اختیار واقتدار کی بنیاد ہوگی۔ اس مرضی کے اظہار کے لیے متعین مدت کے بعد ایسے حقیقی انتخاب منعقد کرائے جائیں گے، جن میں عام اور مساوی حق رائے دہی کا استعمال خفیہ رائے شماری یا اس جیسے کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے گا۔

[آرٹیکل-21]

ہر شہری کو شق 2 میں مذکور کسی تفریق اور غیر مناسب پابندی کے بغیر درج ذیل آزادیاں اور مواقع حاصل ہوں گے:
(الف) مملکت کے امور میں براہ راست یا منتخب نمائندوں کے ذریعے حصے لینے کی آزادی اور مواقع؛
(ب) مقررہ مدت میں ہونے والے ان انتخابات میں ووٹ ڈالنے یا منتخب ہونے کی آزادی اور مواقع جو عام رائے شماری کی بنیاد پر یا خفیہ رائے شماری کے ذریعے ہوں گے اور جن میں رائے دہندگان کو آزادی کے ساتھ اپنی رائے دینے کا حق حاصل ہوگا؛
(ج) مساوات کے عام اصولوں کی بنیاد پر اپنے ملک کی سرکاری ملازمت میں جانے کی آزادی اور مواقع

شہری و سیاسی حقوق کا عالمی معاہدہ
[آرٹیکل-25]

فریق ریاستیں اپنے ملک کی سیاسی و اجتماعی زندگی کی سطح پر عورتوں کے خلاف ہونے والے امتیازی سلوک کے خاتمے اور تدارک کے لیے تمام موزوں اقدامات کریں گی اور بالخصوص مردوں کے ساتھ برابری کی بناء پر عورتوں کے حسب ذیل حقوق کو یقینی بنائیں گی:
(الف) تمام انتخابات اور رائے شماری میں رائے دینے کا حق اور انتخاب کے ذریعے قائم ہونے والے تمام اداروں کا انتخاب لڑنے کا حق؛
(ب) سرکاری حکمت عملی کی تیاری اور تعمیل میں شریک ہونے، سرکاری عہدہ حاصل کرنے اور سرکاری سطح پر جملہ سرگرمیوں میں فرائض منصبی انجام دینے کا حق؛
(ج) ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والی انجمنوں اور غیر سرکاری تنظیموں میں شرکت کرنے کا حق۔

عورتوں کے خلاف امتیاز کی تمام شکلوں کے خاتمے کا معاہدہ
[آرٹیکل-7]

محدود جمہوریت کی طرف واپسی

2018 کا سال پاکستان میں محدود جمہوریت کے تصور کے احیاء کا سال ثابت ہوا۔ عام انتخابات کے بعد عمران خان کی تحریک انصاف نے مرکز کے علاوہ پنجاب اور خیبر پختونخوا کے صوبوں میں حکومت بنائی۔ ضیاء الحق کے بعد یکے بعد دیگرے اقتدار میں آنے والی جماعتوں پاکستان مسلم لیگ نواز اور پاکستان پیپلز پارٹی کی نمائندگی میں کمی آئی اور ان کی کمزوریاں آشکار ہوئیں۔

ایک جانب جہاں اقتدار میں روایتی مذہبی سیاسی جماعتوں کا حصہ اور اثر و رسوخ کم ہوا، وہیں دوسری جانب 2017 میں بننے والی ایک نئی اور زیادہ عسکریت پسند سیاسی جماعت تحریک لبیک یا رسول اللہ (جسے عام طور پر تحریک لبیک پاکستان بھی کہا جاتا ہے) نے عام انتخابات میں اپنی کارکردگی سے تمام مبصرین کو حیران کیا۔ انتخابات کے بعد بھی یہ جماعت اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی یہاں تک کہ 31 اکتوبر کو تحریک نے آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی اور تب سے یہ زیرِ عتاب ہے۔ خواتین کے لیے یہ انتخابات اس ضمن میں خوش آئند رہے کہ ایک نشست پر انتخابات اس لیے منسوخ کیے گئے کہ وہاں خواتین کے ووٹ ڈالنے کی شرح مقررہ حد سے کم رہی۔ پشتون تحفظ موومنٹ کے نام سے شروع ہونے والی سیاسی تحریک کی سرگرمیاں مقتدر حلقوں کی اختلاف رائے برداشت کرنے کی استعداد کو آزماتی رہیں۔

انتخابات کی تیاریاں

نواز شریف کی اقتدار سے رخصتی کے بعد اگرچہ پاکستان مسلم لیگ نواز کی حکومت شاہد خاقان عباسی کی قیادت میں مئی میں اپنی مدت مکمل ہونے تک قائم رہی، تاہم انتخابات کے بعد کی صورت حال کے خدوخال کئی ماہ پہلے سے ہی واضح ہونا شروع ہو گئے تھے۔

گزشتہ برس کے پہلے دو ماہ کے دوران تمام نگاہیں مارچ میں ہونے والے سینٹ انتخابات پر مرکوز رہیں۔ ان انتخابات میں سینٹ کی نصف نشستوں کے لیے ووٹ ڈالے جانے تھے۔ ان انتخابات میں چونکہ مسلم لیگ نواز کو ایوان بالا میں بھی، خواہ تین برس کے لیے ہی سہی، لیکن اکثریت ملنے والی تھی اس لیے ذرائع ابلاغ میں ان انتخابات کے انعقاد کے حوالے سے شکوک وشبہات ظاہر کیے جاتے رہے۔ یہ خدشات اگرچہ بے بنیاد ثابت ہوئے تاہم انتخابات کا انعقاد جن حالات میں ہوا ان سے ملکی تاریخ میں ”پس پردہ کون ہے" جیسے سوالات کا ایک نیا باب رقم ہوا۔

بلوچستان اسمبلی میں حکمران جماعت مسلم لیگ نواز کو اندرونی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ عدم اعتماد کے ووٹ کا سامنا کرنے والی حکومت مستعفی ہو گئی اور باغی اراکین صوبائی اسمبلی نے بلوچستان عوامی پارٹی کے نام سے ایک نیا سیاسی گروہ تشکیل دیا اور حکومت قائم کی۔

اس کے نتیجے میں مسلم لیگ نواز بلوچستان سے ملنے والی سینٹ کی اپنی نشستوں سے محروم ہو گئی۔ مسلم لیگ کو ایک اور عارضی مشکل کا بھی سامنا کرنا پڑا، پنجاب اور دیگر صوبوں میں مسلم لیگ نواز کے نامزد امیدواروں کو جماعت کے جاری کردہ ٹکٹوں پر انتخابات لڑنے سے روک دیا گیا، کیوں کہ یہ ٹکٹ محمد نواز شریف نے جاری کیے تھے۔ محمد نواز شریف کو پارٹی کی سربراہی کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ نواز کے امیدواروں کو آزاد حیثیت میں انتخاب لڑنے اور جیتنے کے بعد مسلم لیگ نواز میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی۔ سینٹ سربراہ کے انتخاب کے موقع پر سینٹ کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ نواز کے خلاف پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان پیپلز پارٹی کے مابین عارضی سمجھوتہ ہو گیا۔ (پنجاب اور سندھ کی بجائے) کسی چھوٹے صوبے کو سینٹ کی سربراہی دلانے کے نعرے کے تحت بلوچستان عوامی پارٹی کے امیدوار صادق سنجرانی کو منتخب کرایا گیا۔ بدلے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار سلیم مانڈوی والا کو سینٹ کا نائب صدر منتخب کرایا گیا۔ آصف علی زرداری اس سے قبل سلیم مانڈوی والا کو سینیٹ کی سربراہی کے لیے پیپلز پارٹی کے سینئر رہنما رضا ربانی پر ترجیح دے چکے ہیں جو اس سے قبل بھی سینٹ کی سربراہی کر چکے ہیں۔ رضا ربانی کی جیت یقینی تھی کیوں کہ انہیں مسلم لیگ نواز کی حمایت بھی حاصل تھی۔

سینٹ انتخابات کے دوران زرداری کو بادشاہ گر قرار دیا گیا تاہم وہ بھی حقیقی منصوبہ سازوں کے سامنے ہلکے پڑ گئے۔

2013 کی طرح اس مرتبہ بھی نگران حکومت کا قیام آسان نہ تھا۔ پنجاب میں نگران وزیر اعلیٰ کی تعیناتی کا عمل پاکستان تحریک انصاف میں پائے جانے والے تذبذب کے باعث ابہام کا شکار رہا۔ معمول کے پارلیمانی عمل

کے ذریعے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس ناصر الملک ملک کے نگران وزیر اعظم جبکہ سابق سول سرونٹ فضل الرحمان سندھ کے نگران وزیر اعلیٰ مقرر کیے گئے۔ مگر خیبر پختونخوا، پنجاب اور بلوچستان کے نگران وزرائے اعلیٰ کا انتخاب الیکشن کمیشن نے کیا۔

انتخابات سے قبل کا ماحول

25 جولائی کو چاروں صوبائی اور قومی اسمبلی کے انتخابات کا انعقاد غیر معمولی ابتری کا شکار رہا۔ انتخابی فضا پر تبصرہ کرتے ہوئے ایچ آر سی پی نے اسے ملکی تاریخ کے بدترین، بڑے پیمانے پر (مقتدر حلقوں کے) زیر اثر اور شدید مخاصمت آمیز قرار دیا گیا۔

پاکستان مسلم لیگ نواز کے جنوب مغربی پنجاب سے منتخب اراکین قومی اسمبلی کا ایک گروہ پارٹی سے علیحدہ ہو گیا۔ یہ اراکین اسمبلی جنوبی پنجاب کے اضلاع پر مشتمل ایک نئے صوبے کے قیام کے مطالبے پر اکٹھے ہوئے۔ الگ صوبے کے قیام کا مطالبہ چند سال قبل پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب سے اٹھایا گیا جسے پورا کرنے میں پیپلز پارٹی ناکام رہی۔ جلد ہی یہ گروہ اپنے اراکین سمیت پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کے ہاں جمع ہوا۔ پاکستان تحریک انصاف نے گرم جوشی کے ساتھ ان اراکین کا استقبال کیا اور نئے صوبے کے قیام کو اپنے اغراض و مقاصد کا حصہ بنایا۔ کچھ ہی عرصے میں پاکستان مسلم لیگ نواز کے 11 ٹکٹ یافتہ امیدوار اپنے ٹکٹوں سے دستبردار ہو گئے اور مسلم لیگ نواز کے لیے ان کا متبادل تلاش کرنا مشکل ہو گیا۔ مسلم لیگ نواز مشکلات سے دوچار جماعت تھی، سو ایسے واقعات اچنبھے کی بات نہیں تھے، تاہم اس بڑے پیمانے پر امیدواروں کا مسلم لیگ نواز کو چھوڑنا حیران کن تھا۔

میڈیا اطلاعات کے مطابق پاکستان مسلم لیگ نواز کے 161 سابق اراکین اسمبلی نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی۔ ملک بھر خاص کر پنجاب کے تمام اضلاع سے ایسی اطلاعات سامنے آئیں جن کے مطابق صاحب بصیرت اہلکاروں نے مسلم لیگ نواز کے حامیوں کو ان کی جدوجہد کے بے ثمر ہونے سے آگاہ کیا۔ سیاسی وفاداریوں میں اس بڑے پیمانے پر تبدیلیاں اور بلوچستان میں ہونے والی بغاوت 1950 کی دہائی کے واقعات کی یاد دلاتے ہیں جب مغربی پاکستان کی اسمبلی میں حکمران مسلم لیگ کے اراکین راتوں رات ری پبلکن پارٹی کو پیارے ہو گئے، ان اراکین کو بعد ازاں مرکز میں حکومتی عہدے بھی ملے۔ پاکستان مسلم لیگ نواز انتخابی دوڑ میں شریک ہونے سے قبل ہی شکست خوردہ تھی۔

صف اول کی دوسری بڑی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی بھی ایسے ہی حالات سے دوچار نظر آئی۔ پیپلز پارٹی کے کئی نامور نام پاکستان تحریک انصاف سے جا ملے۔ اسی دوران سندھ میں حزبِ اختلاف کے متعدد دھڑے پیپلز پارٹی کے خلاف گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس کی صورت میں اکٹھے ہو گئے۔

متحدہ قومی موومنٹ کئی برس قومی اسمبلی میں تیسری سب سے بڑی جماعت اور سندھ سمبلی میں حزب اختلاف کی اہم جماعت رہی ہے، یہ جماعت اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آئی۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) اور

پی ایم ایل۔این اور پی پی پی کے کئی امیدوار انتخابات سے کچھ دن قبل پی ٹی آئی میں شامل ہوئے

جماعت اسلامی کی قیادت میں مذہبی سیاسی جماعتوں نے سخت موقف اختیار کرتے ہوئے 1990 کی دہائی میں بنائے گئے انتخابی اتحاد متحدہ مجلس عمل کی بحالی کا فیصلہ کیا۔

پاکستان تحریک انصاف اور اس کی اتحادی مسلم لیگ (ق) اور شیخ رشید کی آل پاکستان مسلم لیگ ایسی جماعتیں تھیں جو ہر قسم کے خوف خطرے کے بغیر انتخابات میں شریک ہوئیں۔عمران خان نے اپنی تیز اور بے باک انتخابی مہم کے ذریعے اپنے مخالفین کو انتخابی دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا۔تحریک لبیک پاکستان کی قیادت کو بھی یہ یقین تھا کہ 2017 کے فیض آباد دھرنے نے ان کے لیے اقتدار کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔

انتخابی فضا تمام جماعتوں کے لیے یکساں طور پر سازگار نہیں تھی۔ایچ آر سی پی اور پلڈاٹ جیسی ملکی تنظیموں کے اس تجزیے کی تائید یورپی انتخابی مبصرین نے بھی کی، باوجود اس کے کہ یہ رائے پاکستانی حکام کی ناراضی کا سبب بن سکتی تھی۔انتخابات سے کچھ عرصہ قبل الیکشن کمیشن پاکستان نے ووٹرز کی حتمی فہرست جاری کی۔ملک میں ووٹرز کی کل تعداد دس کروڑ پچاس لاکھ سے زائد بتائی گئی جو 2013 کی نسبت 23 فیصد زائد تھی۔مرد ووٹروں کا تناسب 55.9 فیصد جبکہ خواتین ووٹروں کا کل تناسب 44.1 فیصد رہا، مرد اور خاتون ووٹروں کی شرح میں اس قدر فرق کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔نوجوان ووٹرز کی تعداد چار کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔گزشتہ عام انتخابات کے مقابلے میں اقلیتی ووٹروں کی تعداد میں تیس فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا۔

انتخابی عمل کے دوران سیاسی جماعتوں کی اپنے منشور سے دلچسپی میں مزید کمی دیکھنے میں آئی۔متحدہ مجلس

عمل، تحریک لبیک پاکستان اور پاکستان پیپلز پارٹی نے جون کے مہینے میں اپنے منشور جاری کر دیئے، جبکہ مسلم لیگ نواز، پاکستان تحریک انصاف اور متحدہ قومی موومنٹ نے جولائی میں اپنے منشور عوام کے سامنے پیش کیے۔ موخرالذکر دونوں جماعتوں نے تو اپنے منشور انتخابات سے محض دو ہفتے قبل جاری کیے۔ انتخابی منشوروں پر عوامی بحث کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ ہی ایسا کرنے کی کسی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ منشور سازی کو ایک معمولی اور غیر اہم فریضہ خیال کرتے ہوئے یہ کام مشیران یا پیشہ ور معاونین کے سپرد کر دیا گیا۔

پارٹی ٹکٹوں کی تقسیم کے لیے امیدواروں کے چناؤ میں بعض نئے رجحانات دیکھنے کو ملے۔ تمام جماعتوں خاص کر پاکستان تحریک انصاف کا تمام تر زور انتخابی گھوڑوں کو گھیرنے پر رہا۔ کسی بھی امیدوار کے لیے برادری کے علاوہ ٹکٹ کے حصول کا اہم ترین معیار انتخاب جیتنے کی اہلیت خاص کر رقم خرچ کرنے کی صلاحیت تھی۔ اس مرتبہ انتخابی گھوڑوں کی تلاش کا کام جس شد و مد سے کیا گیا اور اس دوران عوامی عہدے کے لیے موزونیت کی شرط کو جس بڑے پیمانے پر نظر انداز کیا گیا، اس سے عہدے کے لیے قابل امیدواروں کی تلاش کے رجحان کو بڑے پیمانے پر نقصان پہنچا۔

انتخابی عمل میں تشدد

انتخابات کے دوران بڑے پیمانے پر تشدد کے خدشات موجود تھے، اگرچہ کسی بھی گروہ نے ایسی کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ جمہوری عمل کو مذہبی شدت پسندوں کی جانب سے لاحق خطرات میں کوئی شک نہیں۔ انتخابات سے صرف دو ہفتے قبل ہونے والے ایک خودکش حملے میں ہارون بلور کی 12 ساتھیوں سمیت ہلاکت حکام کی تشویش میں اضافے کا باعث بنی۔ ہارون بلور خیبر پختونخوا اسمبلی کی ایک نشست کے لیے عوامی نیشنل پارٹی کے امیدوار تھے۔ اس کے فوراً بعد مستونگ میں ایک انتخابی جلسے میں ہونے والے بم حملے میں نامور اور بارسوخ سیاست دان سراج رئیسانی 127 افراد کے ہمراہ ہلاک کر دیئے گئے۔ وہ بلوچستان اسمبلی کی ایک نشست کے لیے انتخابات لڑ رہے تھے۔ یہ حملہ 2018 کے انتخابات کا بدترین حملہ تھا۔ انتخابات کی شام خیبر پختونخوا اسمبلی کے لیے انتخاب لڑنے والے اکرام اللہ گنڈا پور کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ہلاک کر دیا گیا۔ حملے کی ذمہ داری تحریک طالبان پاکستان نے قبول کی۔ حکام کے لیے یہ امر باعث اطمینان رہا کہ 2013 کی نسبت 2018 کے انتخابات میں پر تشدد واقعات کی تعداد بے حد کم رہی، 2013 میں ایسے حملوں کی تعداد 148 تھی۔

فوجی دستوں کی تعیناتی

اس بات کا امکان موجود ہے کہ دہشت گرد کئی لاکھ فوجیوں کی تعیناتی کے باعث اپنے عزائم کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ فوج نے انتخابی عمل میں اپنی شمولیت پولنگ مراکز پر پولنگ کا ساز و سامان پہنچانے کے عمل کی نگرانی سے شروع کی۔ فوجی دستوں نے پولنگ مراکز کا نظم و نسق 23 جولائی کو عام انتخابات سے دو روز قبل سنبھالا۔ سیکیورٹی کے

پشاور میں ایک خودکش بم دھماکے میں ہارون بلور اور 12 دیگر افراد ہلاک ہوئے

انتظامات کو عوامی تائید حاصل ہوئی۔ تاہم فوجی جوانوں کے پولنگ مراکز اور پولنگ بوتھ کے اندر داخل ہونے اور قطاریں درست کرانے کے عمل پر انتخابی مبصرین، جمہوریت پسند شہریوں اور امیدواروں کی جانب سے بجا طور پر احتجاج کیا گیا۔فوج کا یہ طرز عمل مسلمہ عالمی ضوابط کے منافی ہے جن کے تحت سیکیورٹی اہلکاروں کو پولنگ بوتھ سے ایک مناسب فاصلے پر رہنا چاہیے۔

انتخاب کے روز پولنگ کا عمل بڑی حد تک پرامن رہا۔ الیکشن کمیشن نے پاکستان تحریک انصاف کی جانب سے پولنگ کا دورانیہ ایک گھنٹہ بڑھانے کی تجویز بجا طور پر تسلیم کرلی۔ پولنگ کا وقت ختم ہونے تک لوگوں کی بڑی تعداد پولنگ مراکز کے باہر قطاریں بنائے کھڑی تھی۔ مسلم لیگ نواز کی جانب سے پولنگ کا وقت بڑھانے کی درخواست کی گئی تاہم الیکشن کمیشن کی جانب سے یہ درخواست رد کردی گئی اور صرف ان افراد کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دی گئی جو پولنگ مراکز کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ سیکیورٹی فورسز کے مختلف جتھوں کی جانب سے مختلف مقامات پر اس ہدایت پر مختلف طرح سے عمل کیا گیا۔

دھاندلی کے الزامات

پولنگ کے اختتام کے بعد جو کچھ ہوا اس کی نظیر پاکستان کی انتخابی تاریخ میں نہیں ملتی۔ سیکیورٹی فورسز کی جانب سے پولنگ مراکز کا نظم ونسق سنبھال لیا گیا اور تمام پولنگ ایجنٹوں کو ایک گھنٹے بعد آنے کا کہا گیا۔ اس عمل سے انتخابات کی شفافیت مشکوک ہوگئی۔ انتخابی نتائج کے اعلان میں تاخیر، ووٹوں کی گنتی کے بعد ملک کے مختلف حصوں سے انتخابی نتائج کی کنٹرول روم تک ترسیل کے لیے بنائے گئے ریپڈ ٹرانسمیشن نظام کی معطلی اور جامع نتائج کے اعلان میں تاخیر سے ان

شکوک وشبہات میں اضافہ ہوا۔ مبینہ طور پر یہ نظام بیٹھ گیا تھا۔ اس نظام کو فعال رکھنے کی ذمہ داری نادرا پر عائد تھی۔ نادرا کی جانب سے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ نظام ناکارہ نہیں ہوا تھا بلکہ معطل کر دیا گیا تھا۔

ان شکایات کے بل بوتے پر انتخابات ہارنے والی جماعتوں اور متعدد دیگر حلقوں کی جانب سے انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کا دعویٰ کیا گیا۔ تاہم انتخابات میں شکست پانے والی بڑی جماعتوں مسلم لیگ نواز اور پاکستان پیپلز پارٹی نے جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمان کی جانب سے نومنتخب اسمبلیوں کا مقاطعہ کرنے اور انتخابات کو کالعدم قرار دینے کے لیے احتجاج کی اپیل تسلیم نہیں کی۔

بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب آگے بڑھا جائے اور دھاندلی کی شکایات کو پارلیمان کے اندر نمٹایا جائے۔ آخر کار اس امر کی تحقیقات کے لیے وزیر دفاع پرویز خٹک کی قیادت میں ایک پارلیمانی کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی کے طریق کار سے متعلق کسی قسم کی معلومات موجود نہیں اور گمان یہی ہے کہ دھاندلی کی تحقیقات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو جائیں گی۔ پاکستان مسلم لیگ نواز اور پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنی بقا کی جنگ درپیش ہے اور انتخابی دھاندلی کا معاملہ بتدریج فراموش کر دیا گیا ہے۔

بہرطور قومی اسمبلی کے 272 حلقوں کے نتائج کچھ یوں رہے:

سیاسی جماعت	نشستیں
پاکستان تحریک انصاف	118
پاکستان مسلم لیگ ن	64
پاکستان پیپلز پارٹی	43
متحدہ مجلس عمل	11
متحدہ قومی موومنٹ۔ پاکستان	6
گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس	2
پاکستان مسلم لیگ۔ق	4
بلوچستان عوامی پارٹی	3
بلوچستان نیشنل پارٹی۔م	3
عوامی مسلم لیگ	1
آزاد امیدوار	12
عوامی نیشنل پارٹی	1
نتائج کا اعلان نہیں کیا گیا	2

انتخابات ملتوی کئے گئے	2

آزاد امیدواروں کی جانب سے مختلف جماعتوں میں شمولیت اور خواتین اور اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستوں پر انتخابات کے بعد قومی اسمبلی میں نشستوں کے اعتبار سے پارٹی پوزیشن تبدیل ہوگئی۔ بالواسطہ انتخابی مرحلے کی تکمیل کے بعد الیکشن کمیشن نے قومی اسمبلی میں سیاسی جماعتوں کی حتمی پوزیشن جاری کی۔

سیاسی جماعت	نشستیں
پاکستان تحریک انصاف	158
پاکستان مسلم لیگ ن	82
پاکستان پیپلز پارٹی	63
متحدہ مجلس عمل	15
متحدہ قومی موومنٹ۔ پاکستان	7
پاکستان مسلم لیگ۔ق	5
بلوچستان عوامی پارٹی	5
بلوچستان نیشنل پارٹی	4
گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس	3
جمہوری وطن پارٹی	1
عوامی نیشنل پارٹی	1
عوامی مسلم لیگ	1
آزاد امیدوار	4

صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں بلوچستان میں بلوچستان عوامی پارٹی کو تمام جماعتوں سے زیادہ صوبائی نشستیں حاصل ہوئیں، خیبر پختونخوا میں پاکستان تحریک انصاف پہلے سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے اقتدار میں واپس آئی، سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی اپنی حکومت برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ مرکز کی نسبت پنجاب میں پاکستان تحریک انصاف کو مسلم لیگ نواز کی جانب سے زیادہ شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدائی گنتی میں مسلم لیگ نواز نے پاکستان تحریک انصاف سے زیادہ نشستیں حاصل کیں تاہم آزاد امیدواروں کی شمولیت کے بعد پاکستان تحریک انصاف پنجاب میں بھی حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

مذہبی سیاسی جماعتیں

جمعیت علمائے اسلام–ف، جماعت اسلامی اور مجلس وحدتِ مسلمین جیسی مذہبی سیاسی جماعتوں کے ساتھ

ساتھ نصف درجن کے قریب عسکریت پسند جماعتیں بھی مذہبی چھتری تلے انتخاب میں شریک ہوئیں۔ ذرائع ابلاغ کی جانب سے بعض کالعدم (دہشت گرد) تنظیموں کی انتخابات میں شمولیت پر خوب واویلا مچایا گیا مگر بے سود۔

الیکشن کمیشن نے لشکر طیبہ کی سرپرست جماعت الدعوۃ کو رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا، تاہم جماعت الدعوۃ کے مطابق اس نے ملک بھر میں اللہ اکبر تحریک کے پلیٹ فارم سے 200 کے قریب امیدوار کھڑے کیے۔ جماعت الدعوۃ نے 20 خواتین کو ٹکٹ دینے کا بھی دعویٰ کیا۔ کئی دیگر مذہبی گروہوں کی جانب سے بھی سیاسی جماعتیں رجسٹر کرائی گئیں ان جماعتوں کے پلیٹ فارم سے امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی بھی جمع کرائے گئے اور اس امر کا اعلان ٹی وی چینلوں پر بھی کیا گیا۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے ایسے افراد کے خلاف کارروائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا جن کے بارے میں دہشت گرد گروہوں سے وابستگی کے شبہات موجود تھے، اس فیصلے کے لیے یہ عذر پیش کیا گیا کہ کمیشن رجسٹرڈ جماعتوں کے ساتھ شامل ہونے والوں کے خلاف کارروائی نہیں کرسکتا۔ یہ سوال تا حال جواب طلب ہے کہ اگر ایک رجسٹرڈ جماعت دہشت گرد کارروائیوں میں ملوث پائی جائے تو کمیشن کیا کارروائی کرے گا۔

تحریک لبیک پاکستان کے انتخابی ہتھکنڈے

اگرچہ زیادہ تر مذہبی جماعتیں عوامی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہیں، لیکن فیض آباد دھرنے سے شہرت پانے والی تحریک لبیک پاکستان نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کراچی سے سندھ کی صوبائی اسمبلی کی دو نشستیں جیتنے کے ساتھ ساتھ اس جماعت کو پنجاب میں تحریک انصاف اور پاکستان مسلم لیگ نواز کے بعد سب سے زیادہ ووٹ ملے۔

اس متاثر کن کارکردگی نے تحریک لبیک پاکستان کو عوامی معاملات میں جارحانہ موقف اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ 31 اکتوبر کو تحریک نے سپریم کورٹ کی جانب سے توہین مذہب و رسالت کے مقدمے میں سزائے موت کے خلاف آسیہ بی بی کی اپیل منظور کیے جانے پر ملک گیر احتجاج کیا۔ احتجاجی مظاہرین نے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور متعدد مقامات پر گاڑیوں سمیت دیگر املاک کو نقصان پہنچایا۔ تحریک لبیک پاکستان کی قیادت خود کو ان پر تشدد واقعات سے بری الذمہ قرار دیتی رہی، تاہم تحریک کو سوشل میڈیا اکاؤنٹس پر وزیر اعظم اور فوجی سربراہ پر رکیک حملوں کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ اس امر کو انہی ہاتھوں کو ڈسنے کے مترادف قرار دیا جاسکتا ہے جنہوں نے فیض آباد دھرنے کے دوران انہیں دودھ پلایا تھا اور ایک سازگار معاہدہ یقینی بنایا تھا۔ تحریک لبیک پاکستان کے رہنما اور کارکن بڑی تعداد میں حراست میں لیے گئے، تاہم ابھی تک ان کے خلاف مقدمات میں کسی عدالتی پیش رفت سے متعلق کوئی خبر سامنے نہیں آئی۔

الیکشن ایکٹ میں کسی حلقے میں خواتین کے ڈالے گئے ووٹوں کی شرح رجسٹرڈ ووٹوں کے 10 فیصد سے کم رہنے پر وہاں انتخابات منسوخ کیے جانے کی نئی شق شامل کی گئی۔ ان انتخابات میں اس شق کے نفاذ کا موقع خیبر پختونخوا کے حلقے شانگلہ میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے دوران سامنے آیا، جہاں انتخابات منسوخ کیے گئے۔

دو بڑی جماعتوں مسلم لیگ نواز اور پاکستان پیپلز پارٹی کو پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری محض ان کے خلاف صف آرا قوتوں پر نہیں ڈالی جاسکتی، ان نقصانات کی ذمہ داری ان جماعتوں کے کمزور ڈھانچے اور اور اپنے

مرکزی رہنماؤں پر انحصار پر بھی عائد ہوتی ہے۔ بظاہر ان جماعتوں کی قیادت نے خود کو حالات کے سپرد کرنے کا آسان راستہ منتخب کیا۔ اپنی جماعتوں کو جمہوری خطوط پر استوار کرنے میں ناکامی نہ صرف ان کے اپنے لیے مشکلات کا باعث بنی بلکہ اس سے ملک میں جمہوریت کی جانب سفر میں بھی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

پشتون تحفظ موومنٹ کا منظر عام پر آنا

پشتون تحفظ موومنٹ کی مقبولیت میں اضافے پر حکومت کی جانب سے معقول ردعمل کا فقدان 2018 کی ایک اہم سیاسی پیش رفت ہے۔ اس تحریک کا جنم محسود قبیلے کی جانب سے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے بنائے گئے ایک گروہ سے ہوا۔ منظور پشتین جیسے مقرر نے اس گروہ کی قیادت سنبھالنے کے بعد تمام پشتون قوم بالخصوص قبائلی علاقوں میں مقیم پشتونوں کے مسائل کے حل کے لیے آواز اٹھانے کا فیصلہ کیا، منظور پشتین نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران پشتونوں کو پہنچنے والے نقصان کو بھی اپنے موقف کا حصہ بنایا۔ اگرچہ انتظامیہ اور سکیورٹی اداروں کا ایک حصہ اس تحریک کے ساتھ بامعنی مذاکرات پر یقین رکھتا ہے، لیکن حکام کی جانب سے پشتون تحفظ موومنٹ کی قیادت کے مطالبات کو شک کی نظر سے دیکھا گیا۔ پشتون تحفظ موومنٹ کے دو رہنما محسن داوڑ اور علی وزیر جو اپنے علاقے میں خاطر خواہ اثر ورسوخ کے مالک ہیں، 2018 کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

12 اگست 2018 کو پشتون تحفظ تحریک کی جانب سے صوابی خیبر پختونخوا میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا، حکام کی جانب سے شدید ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی حقوق کی عالمی شہرت یافتہ کارکن گلالئی اسماعیل اور تحریک کی قیادت سمیت 19 افراد کے خلاف فوجداری مقدمات درج کیے گئے۔ یہ مقدمات تاحال زیر التواء ہیں۔

آخر کار منظور پشتین نے پشتون پٹی اور خیبر پختونخوا سے باہر بسنے والوں کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور لاہور اور کراچی میں جلسوں کا انعقاد کیا۔ سرکاری سطح پر ان جلسوں پر ویسا ہی ردعمل ظاہر کیا گیا جیسا 70 کی دہائی میں ولی خان کی جانب سے اپنی جماعت کو پنجاب میں متعارف کرانے کی کوششوں پر دیا گیا تھا۔ بہت پس و پیش کے بعد لاہور میں جلسے کی اجازت دی گئی، منظور پشتین کو کراچی میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے بیہمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ عین ممکن ہے کہ مقتدر حلقوں کے لیے پشتون تحفظ تحریک کے بعض مطالبات ناقابل تسلیم ہوں، تاہم انتظامیہ کی جانب سے کی گئی کارروائیاں تحریک کو دیوار سے لگانے کے مترادف ہیں۔

پشتون تحفظ تحریک کی راہ مسدود کرنے کے لیے بچھائے گئے جال کی زد میں تحریک کے رہنماوں سے سلام دعا رکھنے والے بھی آ گئے۔ بیشتر سیاسی جماعتوں نے پشتون تحفظ موومنٹ سے فاصلہ رکھنے میں ہی عافیت محسوس کی۔ خیبر پختونخوا کی جماعت عوامی نیشنل پارٹی نے (تحریک سے روابط رکھنے پر) اپنے ممتاز رہنماؤں سابق سینیٹر افراسیاب خٹک اور رکن قومی اسمبلی بشریٰ گوہر کو جماعت سے خارج کر دیا۔

قومی اسمبلی میں آزاد اراکین کی حیثیت سے موجود پشتون تحفظ تحریک کے دو رہنماؤں کو بارہا ہدف بنایا گیا ہے۔ ان کے نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کیے گئے ہیں، تاہم یہ فیصلہ بعد میں واپس لینا پڑا۔ خوف کا یہ عالم ہے

کہ پارلیمان میں حزب اختلاف کے سیاستدان علی وزیر اور محسن داوڑ سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے کتراتے ہیں۔

فاٹا خیبر پختونخوا میں انضمام

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کے خیبر پختونخوا میں انضمام کے بعض تقاضے 2018 میں پورے کیے گئے۔ سب سے پہلے پشاور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار کو فاٹا تک وسعت دی گئی۔ پانچ سالہ مدت کا اختتام نزدیک آنے پر شاہد خاقان عباسی کی قیادت میں قائم حکومت میں یہ شکوک جڑ پکڑنے لگے کہ شاید اس انضمام کے لیے درکار وقت میسر نہیں۔ ایک موقع پر مبینہ طور پر یہ فریضہ اگلی حکومت کے لیے چھوڑ دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ تاہم جلد ہی انضمام کا عمل مکمل کرنے کے لیے پارلیمان سے 25 ویں ترمیم منظور کرا لی گئی۔ مئی کے آخری ہفتے میں خیبر پختونخوا نے قبائلی علاقوں کے انضمام کی توثیق کردی اور وفاقی حکومت کی جانب سے نگران حکومت کے قواعد برائے 2018 کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا۔

قومی اسمبلی کی مدت مکمل ہو جانے کے بعد قائم کی گئی نگران حکومت نے فاٹا خیبر پختونخوا انضمام کا عمل جاری رکھا۔ نگران حکومت نے پولیٹیکل ایجنٹوں کی جگہ ڈپٹی کمشنر تعینات کیے اور دیگر ضروری امور کی انجام دہی کے لیے ایک ٹاسک فورس قائم کی۔ ستمبر میں عمران خان کی نئی حکومت نے اس عمل کی باگ دوڑ سنبھالی، تاہم جلد ہی اس حکومت کو اس وقت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جب پشاور ہائی کورٹ کی جانب سے نگران حکومت کے قواعد برائے 2018 کی بعض شقوں کو آئین سے متصادم قرار دیا گیا۔

فاٹا کے بطور ایک قانونی اکائی انضمام کے باوجود وہاں سول انتظامیہ کی معاونت کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر کوئی اثر نہیں پڑا اور نہ ہی اس مقصد کے لیے قائم کیے گئے عارضی مراکز بند کیے جانے کی کوئی اطلاع سامنے آئی ہے۔

گلگت بلتستان کا متنازع قانون

مسلم لیگ نواز حکومت کے آخری ایام کے دوران 21 مئی کو حکومت بلتستان آرڈر 2018 جاری کیا گیا، اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس قانون کے ذریعے گلگت بلتستان کا درجہ پاکستان کے دیگر صوبوں کے برابر کر دیا گیا ہے۔ گلگت بلتستان کے عوامی حلقوں کی جانب سے ان دعووں کی تردید کی گئی۔ علاقے بھر میں اس کے خلاف احتجاج کیا گیا اور نئے قانون کو گلگت بلتستان (ایمپاوورمنٹ اینڈ سیلف گورنمنٹ) آرڈر 2009 سے بدتر قرار دیا گیا۔ گلگت بلتستان سپریم اپیلٹ کورٹ نے 13 جولائی کو نئے قانون کو منسوخ کرتے ہوئے 2009 کے آرڈیننس کو بحال کر دیا۔ تین ہفتے بعد سپریم کورٹ آف پاکستان نے گلگت بلتستان کی عدالت کے فیصلے کو کالعدم کر دیا۔ 2018 میں اس مسئلے کو حل نہ کیا جا سکا۔